ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.5,Issue No.1(2023)
(January to June)

اُردو غزل کی منفرد اور توانا آواز: ڈاکٹر ماجد مشتاق رائے

Unique and powerful voice of Urdu Ghazal: Dr. Majid Mushtaq Rai

ڈاکٹر مطلوب حسین
لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ گریجویٹ کالج، ساہیوال

Abstract:

Poetry is a good reflection of human emotions.In this regard,The importance of ghazal did not need any introduction. Dr. Majid Mushtaq is a renowned and well-known name in Urdu literature. He holds a special repute in fiction and poetry along with research and criticism. He has also written beautiful couplets in the field of ghazal. His poetry collection "Dard Manzoom Hua" is a proof of this. In this book, he has charmed with colorful subjects. The poetry is mature. Undoubtedly, he can be called a unique and important ghazal poet of modern era.

Key words: poetry, reflection, human emotions, ghazal, fiction, criticism, modern era

ڈاکٹر ماجد مشتاق رائے کا نام اردو دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ شاعری ہو کہ فکشن، تنقید ہو کہ تحقیق، نفسیات ہو کہ فلسفہ، تہذیبی و تمدنی موضوعات ہوں کہ سائنسی علوم اور بشریات وہ اس مہارت تامہ اور روانی سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں کہ سامع ان کی علمی فضیلت، حافظہ، زبان دانی اور بین المتون مطالعہ کا اسیر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ ان کی مجلسی گفتگو کا سحر، ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کے بولنے کے ہنر سے واقف ہے۔ وہ بحیثیت نقاد، محقق، مدون، مترجم اور فکشن نگار اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ لیکن میرا موضوع حال ہی میں ان کا شائع ہونے والا شعری مجموعہ "درد منظوم ہوا" ہے۔ جس کا مطالعہ اس امر پر دلالت ہے کہ وہ بطور شاعر بھی اک منفرد اور توانا آواز کے حامل ہیں۔ ان کی غزلیات کلاسیکی و جدید شعری اسالیب کا ایسا گلدستہ ہیں کہ جس میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ نئے اور اچھوتے موضوعات قاری کو دلفریب اور ایسے دلکش جہانوں کی سیر کرواتے ہیں کہ شعر کی داد دینا اس کی مجبوری بن جاتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ غزل کا خمیر محبوب اور محبت کی متنوع جلوہ سامانیوں سے تشکیل پایا اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔ ماجد مشتاق کے ہاں اس روایت کا تسلسل بخوبی نظر آتا ہے۔ ان کے دیوان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جو اس نوعیت کے اشعار سے خالی ہو۔ اس پر کمال یہ کہ اس طرز کے اشعار میں ان کا متخیلہ پوری شدت کے ساتھ متحرک اور چاک و چوبند دکھائی دیتا ہے۔ وہ جب اپنے محبوب کا ذکر کرتے ہیں تو ولی کے تصور جمال کی روایت کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ جس پری تمثال کے حسن کے سحر میں گرفتار ہیں اس کا حسن ایسا لاثانی ہے کہ انسان تو انسان، خود نظارہ بھی اس کے جمال کے کمال کا شیدائی ہو کر پیہم اسے دیکھتا ہی چلا جاتا ہے:

باعث صد ہا سعادت باعث عز و وقار
اس کو نظارہ بھی پیہم دیکھتا رہ جائے گا(۱)

عشاق کی قسمت میں وصال یار کے لمحات شاذ ہی آتے ہیں ورنہ ان کی بیشتر زندگی فراق معشوق میں تڑپتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ ہجر کے ان مشکل لمحات میں طالب بارہا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر محبت کا یہی صلہ ملتا ہے تو اس سے کنارہ کشی کر لینا ہی بہتر ہے مگر ایسی باتیں کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہے کہ محبت کرنے والوں کے لیے ترک محبت موت سے بھی اگلی کوئی صورت ہوتی ہے۔

ماجد کے ہاں بھی ایسے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں کہ جہاں ایک طرف تو وہ محبوب اور محبت سے راہ فرار حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف اگلے ہی لمحے انہیں اس معاملے میں اپنی عاجزی اور دل کی مجبوری کا احساس اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے:

تھا ، حقیقت وہ بھلا دینا ہمارا تجھ کو
تیری الفت سے بھی آزاد نہ ہوں گے
لیکن(۲)

جن دوستوں کی زیر نظر شاعر سے بالمشافہ ملاقات رہی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے پیش نظر سگریٹ اور چائے کا مرتبہ کسی بھی طور معشوق مجازی سے ہر گز کم نہیں۔ میرے خیال میں ان سے ہر درخواست، فرمائش اور جائز ناجائز بات منوائی جا سکتی ہے مگر سگریٹ اور چائے تو شاید وہ خود اپنے آپ کے کہنے یا ارادہ کرنے سے بھی ترک نہیں کر سکتے۔ ایسے میں اگر کسی ماہ لقا کے کہے پر وہ نہ صرف سگریٹ کو بجھا دیں بلکہ اس صاحب جمال کے تکلم پر روح تک جھوم اٹھیں تو ایسے واقعے کو پہلی نظر کے عشق سے کم مرتبہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ اب اس تناظر میں ماجد مشتاق کا ایک شعر ملاحظہ کریں اور پھر اپنے متخیلہ میں ذرا شاعر اور شعر کی کیفیت کے درواکر کے اس لمحے کی سرشاری خود پر طاری کریں آپ کا دل اس منظر کے تصور اور تصویر پر خود بخود فدا ہو جائے گا:

وہ پہلا تکلم کہ میں سگریٹ کو بجھا دوں
اس لطف و کرم پر میرا دل جھوم اٹھا ہے(۳)

متذکرہ پہلی نظر کا عشق جہاں شاعر کے لیے راحت جاں کا باعث بنا وہیں پر اس یک نگاہ کے وار نے ان کی ذات و حیات سے سب صبر و قرار بھی چھین لیا۔ سگریٹ کے کش اور چائے کے نیم گرم بوسے اپنا سبھی لطف و نشاط کھو بیٹھے۔ آہ و زاری اور اختر شماری نے ان کے دل اور قویٰ پر ایسے ڈیرے ڈال لیے کہ رشک قمر کی فرقت میں ایک شب کا گزارنا ازل سے ابد تک کی مسافت میں بدلتا نظر آنے لگا۔ ماجد نے اپنی اس داخلی کیفیت کو بڑے عمدہ رنگ میں پیش کیا ہے:

تجھ سے بچھڑ کے کیوں نہ ہوں اختر
شماریاں
فرقت میں شب گزر گئی رشک قمر سے
دور(۴)

طالب ہمیشہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کے مطلوب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا خوب صورت ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کی سب رونقیں، رعنائیاں اور رنگینیاں اس کے یار کے حسن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ماجد مشتاق کے اشعار بھی

جمال معشوق کی تحسین کی روایت کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اپنے دوست کو بہار کے منظر سے نسبت دیتے ہوئے اس کی دلکشی کا اعلان کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں اس الجھن نے پریشان کر رکھا ہے کہ محبوب کے سراپے کے دیدار کے بعد کوئی بھی دوسرا حسین منظر اب ان کی آنکھوں میں ٹھہر نا پائے گا۔ یوں لگتا ہے جیسے حسن جاناں کی کشش نے ان کی آنکھوں کی بینائی کو قزاق بن کے لوٹ لیا ہو:

یوں تو مرا نصیب تھے منظر بہار کے
اک شخص لے گیا مری آنکھیں نکال کے (۵)

اسی حوالے سے ایک اور شعر ملاحظہ کریں کہ جس میں شاعر نے درج بالا استدلال کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے کہ شعر ایسا جمالیاتی مرقع اور غنائیت کا مجسمہ بن گیا ہے جس کی لذت آفرینی سے انکار کفران نعمت سے کسی طور کم نہیں:

پھولوں کی مہک زلف کی چھاوں میں ملے گی
خوبی یہ فقط ماہ لقاوں میں ملے گی (۶)

محبت کے باب میں مہ وشوں کی سرد مہری عشق کے سفر کا لازمی جز ہے۔ عاشق وفا کا مجسمہ بن کر سامنے آتا ہے تو معشوق جفا شعاری میں ید طولی رکھتا ہے۔ ایک طرف مہر کی نگاہ ہے کہ جو ہر دم یار کے لیے فرش راہ بنتی چلی جاتی ہے تو دوسری طرف قہر اور غضب ناکی سے بھرپور آگ برساتی چشم فسوں ساز جو نہ تو طالب کو آزاد کرتی ہے اور نہ اس کے سوز سے تڑپتے سینے کو قرار عطا ہونے دیتی ہے۔ ماجد مشتاق کا واسطہ بھی ایسے ہی کینہ خو یار طرح دار سے ہے۔ ان کے اشعار اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ محبت ان کے لیے پھولوں کی سیج سے زیادہ ایسا کانٹوں کا بستر ہے جسے وہ ترک بھی نہیں کر سکتے:

جو ازل سے میں نے وفائیں کیں جو وفائیں کیں تو خطائیں کیں
میرے کینہ خو نے جفائیں کیں یہ بدل ستم گر نے کیا دیا (۷)

کسی بھی فن کار کی دور بین نگاہ اپنی مشاہداتی قوت کے بل بوتے پر آنے والے زمانوں کے حالات و واقعات کو کلی طور پر نہ سہی جزوی طور ہی سہی جانچ لیتی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار جس قدر اس فن میں طاق ہو گا اسی قدر اس کی ادبی فنی وقعت اپنے ہم عصروں میں انفرادیت کی حامل ہو گی۔ خاص طور پر شاعر اور شاعری کو یہ کمال حاصل ہے کہ اس کی دور مار توپ سے باریک سے باریک پہلو بھی بچ نہیں پاتا۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شاعر حالات حاضرہ سے بیگانہ نظر آئے۔ میر تقی میر ہو کہ آتش و غالب ان کی شاعری اپنے عہد کی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے وقت کے حالات و واقعات جاننے ہوں تو ناصر کاظمی کا کلام پڑھ لیجیے یوں لگے گا کہ ہم ہجرت اور فسادات کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ماجد مشتاق کے کلام میں بھی یہ وصف بدرجہ غایت موجود ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ مشاہدے کی خداداد صلاحیت انھیں کثرت سے عطا کی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات پر نہ صرف دسترس رکھتے ہیں بلکہ وہ ان مسائل کو بھی اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کو ان کے دیگر عصری شعرا فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اس پر ان کا بے لاگ اور غیر جانبدار رویہ قاری کو پوری طرح اپنے دام کا اسیر بنالیتا ہے:

مجھ پہ زخموں کی نمائش کا بھی الزام آیا
وقت کی بات ہے ظالم یہاں مظلوم ہوا (۸)

ماضی کا ذکر ہو کہ زمانہ حال کی داستان پاکستان کے حصے میں ہمیشہ ایسے ہی رہنما آئے ہیں جن کا مطمح نظر ملکی فلاح و ترقی کی بجائے اپنی ذات رہا ہے۔ وہ ملک کے سادہ لوح باشندوں کو دعووں اور محض طفل تسلیوں کے جال میں یوں مقید رکھتے ہیں کہ ان کے لیے حق و باطل میں فرق کرنا تک ممکن نہیں رہتا۔ ماجد نے عوام کی اس بے چارگی کو بھی بڑے عمدہ انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ ایسے اشعار میں جہاں شاعر کے مشاہدے کی گہرائی کی عکاسی ہوتی ہے وہیں پر ان کی اپنے ہم وطنوں اور وطن سے محبت کی جھلک بھی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے:

وہ رہروؤں کو روز دکھائیں نیا سراب
رہبر ہمارے عہد کے دعووں میں فرد ہیں(۹)

موجودہ دور حیات زندگی کے ہر شعبے میں ابتذال کا ایسا شکار ہو چکا ہے کہ اس کے چنگل سے نکلنا ناممکن صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہمارا شاید ہی کوئی سرکاری و غیر سرکاری ادارہ یا نجی کاروبار ایسا ہو گا کہ جو کرپشن اور ملاوٹ سے پاک ہو۔ ورنہ اخلاقی جرائم اور معاشرتی برائیاں زندگی کے ہر میدان کو اپنی لپیٹ میں لے کر اچھے اور برے، غلط اور درست کی تمیز ختم کرتی جا رہی ہیں۔ ماجد مشتاق کے اشعار میں اس معاشرتی زوال کو نہ صرف بیان کی راہ دکھائی گئی ہے بلکہ اس پر طنز کے تیکھے وار کرتے ہوئے جرم سے اپنی نفرت کا دوٹوک اظہار بھی کیا گیا ہے:

شیر خواروں کو بھی اب دودھ نہیں ملتا ہے
دودھ کے قطرے کو ترسے ہیں گوالے اب کے(۱۰)

ہمارے زیر مطالعہ شاعر کو اس بات کا بھی شدید صدمہ ہے کہ آج کے زمانے میں انسان اپنا وقار، مقام اور مرتبہ کھو چکا ہے۔ ان کے بقول انسان کہ جسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے موجودہ مشینی دور میں اتنا سستا ہو چکا ہے کہ مشینوں کی قدر اس سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ ہر گزرتے وقت کے ساتھ انسان ترقی کے زینے چڑھتا جا رہا ہے لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مشینی عروج، ترقی سے زیادہ اخلاقی و انسانی قدروں کے زوال کا سفر ہے جسے عظمت انسان کا قائل شخص نہ تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی یہ تبدیلی اس کے مزاج میں قبولیت کا شرف حاصل کر سکتی ہے:

اب مشینیں قیمتی ہیں آدمی ہیں بے وقار
میں ترقی کے زمانے کی ادا سمجھا نہیں(۱۱)

اختلاف رائے اور ایک دوسرے کے نظریات کا احترام باشعور اور صحت مند معاشرے کی پہچان ہوتا ہے۔ لٹریچر بھی ایسے بہت سے تصورات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جیسے وحدت الوجود، شہود، جبر، قدر اور دیگر کئی مذہبی و معاشرتی متنازعہ و تسلیم شدہ حقائق۔ ہمارا کلاسیکی ادب خاص طور پر ایسی بحثوں سے مزین نظر آتا ہے۔ یوں ہی آج کے ادیب کے ہاں بھی اس روایت کی متنوع صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ماجد مشتاق کی شاعری بھی ایسے علمی و ادبی مناظروں سے خالی نہیں۔ وہ جب زندگی اور معاملات حیات و کائنات کو اپنے شعر کا موضوع بناتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ حضرت انسان کو بہت سے مسائل و معاملات میں مجبور محض اور لکھ دیے گئے کا پابند سمجھتے ہیں جو انہیں جبریہ مکتبہ فکر کا ترجمان اور معترف ثابت کرتا ہے۔ ایسے اشعار میں جب وہ اپنے ہم نفسوں اور ان کی زندگی کی پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہیں جو لاکھ کوشش کے باوجود سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتیں تو ان کا اسلوب حزن و یاس کی ایسی لے بن جاتا ہے جو

شعر پڑھنے اور سننے والوں کی روح تک کو غمگین کر دیتا ہے:

اپنا یوں مرگ تمنا پہ وہ ماتم کرنا
یہی لکھا تھا ازل سے یہی مقسوم ہوا(۱۲)

دنیا اور دنیا کی تمام اشیاء بشمول انسان اور چرند، پرند کا وجود فنا کے فلسفے پر ترتیب دیا گیا ہے۔ کوئی بھی حیاتی و کائناتی رکن ایسا نہیں جس کو ثبات حاصل ہو۔ اسلامی مذہبی تعلیمات اور قرآن و احادیث کی روشنی میں اس امر پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ میرے خیال میں فنا کے اصول میں ہی انسان کی انسانیت کی بقا پوشیدہ ہے ورنہ اگر کائنات سے مرگ کا تصور مٹا دیا جائے تو ہر دوسرا شخص خود پر ایسی آزادی طاری کر لے گا کہ اصل میں کہیں کا نہیں رہے گا۔

شاعری میں دنیا کو سراب، دھوکا اور عارضی کہنے کا زیادہ تر رجحان صوفی شعرا کے ہاں ملتا ہے لیکن یہ روایت صرف ان تک ہی محدود نہیں ہے۔ اگر زیر مطالعہ شاعر کی بات کی جائے تو ان کے کلام میں بھی اس نوعیت کے اشعار پوری شدت تاثر کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی نظر میں دنیا ایک ایسے سرائے کی مانند ہے جہاں انسانوں کا آنا جانا بالکل اسی طرح لگا رہتا ہے جیسے یہ کوئی مہمان خانہ ہو۔ دنیاوی زندگی کو مہمان سرائے سے نسبت دینا ہماری اردو شاعری کا عام چلن ہے مگر ماجد مشتاق کی اس صلاحیت کا اعتراف کرنا بھی لازم ہے کہ انہوں نے اس عمومی نوعیت کے مضمون کو اسلوب کی سادگی اور پیش کش کی ندرت سے ایسی تازگی عطا کر دی ہے کہ شعر کا مضمون روایت کے ساتھ جڑت کے باوجود اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب رہا ہے:

لازمی ہے سرائے سے سبھی کو جانا
آج آتا ہے کوئی تو کوئی کل جاتا ہے(۱۳)

اسی تناظر میں ان کا ایک اور شعر دیکھیے جس میں انھوں نے اپنی ذاتی موت کی خبر دے کر خیال آفرینی کی ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے جو شاعر کے متخیلہ کی بلندی اور ایک ہی موضوع کو نئے نئے استدلال اور متون میں پیش کرنے کی خداداد صلاحیت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

چکھنا پڑا ہے موت کا ماجد کو
ذائقہ
بنتی رہی ہے یوں تو ہمہ دان
زندگی(۱۴)

ماجد مشتاق کی سوانح کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ان کی ذات اس حوالے سے بہت خوش قسمت واقع ہوئی ہے کہ انھیں نہ تو کسی قسم کی معاشی دشواری کا سامنا ہے اور نہ ہی ایسے معاشرتی مسائل کہ جو ان کے لیے اذیت یا پریشانی کا باعث بنیں۔ ان کی گھریلو زندگی بھی ہر لحاظ سے اطمینان بخش ہے۔ تو پھر آخر کون سی ایسی وجوہات یا اسباب ہیں جو ان کی شاعری کو حزن و یاس کی طرف راغب کرتی ہیں۔ اس حوالے سے جہاں تک میری ذاتی رائے ہے تو یہ رنگ ان کے ہاں شاعرانہ روایت سے ہوتا ہوا منتقل ہوا ہے مگر انہوں نے اس روایت کو اپنے کلام میں اس طرح نبھایا ہے کہ ایک سنگ دل شخص بھی ان کے دیوان کے بعض اشعار پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں شاعر کو بذات خود بھی یہ زعم ہے کہ ان کے کلام میں اشک جاری کروا دینے اور پتھر کو پگھلا دینے کا ہنر موجود ہے۔ دیکھیے کس طرح شاعرانہ تعلی کے انداز میں اپنی اس شاعرانہ خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

درد دل وہ ہے کہ اشکوں میں بدل جاتا

ہے

سوز جاں ایسا کہ پتھر بھی پگھل جاتا ہے(۱۵)

اسی رنگ کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں کہ جس میں شاعر ایک طرف تو عاشق کے صبر کی شکستگی کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف طالب کے فراق یار میں شب بھر رونے دھونے اور آہیں بھرنے کی تصویر کشی اس عمدگی سے کی گئی ہے کہ سارا منظر قاری کے سامنے مجسم ہو کر آن ٹھہرتا ہے:

حوصلے صبر کے بھی ٹوٹتے دیکھے ہیں بہت

شب آخر کوئی سو جاتا ہے آئیں بھر کے(۱۶)

ماجد مشتاق کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس باب میں اکتسابی سے زیادہ وہبی عمل کے قائل ہیں اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ میرے اشعار میری ذاتی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ مجھے جب کوئی غم یا پریشانی داخلی طور پر پریشان کرتی یا اذیت دیتی ہے تو ان حزنیہ لمحات کی کیفیات خود بخود اشعار کی صورت میں میری زبان سے ادا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسے اشعار ثابت کرتے ہیں کہ وہ اس میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں یہ الگ بات کہ وہ ادب کا ایسا برا عظم ہیں کہ جو خود آشکار نہیں ہوتا بلکہ ان کے مزاج کی یکتائی چاہتی ہے کہ کوئی سچا اور پکا ادبی پارکھ انھیں خود سے دریافت کرے، سمجھے، جانچے اور پھر ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کا اعلان کرے:

نالہ اٹھتا ہے فضاؤں میں تو کوشش کے

بغیر

کتنی آسانی سے ہر درد ہی منظوم ہوا(۱۷)

جو انسان ہر لمحہ ہر وقت پریشان رہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی ایسا غم اور اذیت پال لے جیسے اس کے ساتھ کوئی بہت بڑا حادثہ یا واقعہ رونما ہو گیا ہو ایسے فرد کو مزاجاً قنوطی کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ہمیں زندگی میں کسی ایسے شخص سے واسطہ پڑے جو بڑی سے بڑی مشکلات کو بھی خاطر میں نہ لائے تو اس کے لیے رجائی کی اصطلاح رائج ہے۔ قنوطیت انسان کو ناکامی سے دوچار کرتی جب کہ رجائیت ناکامی میں بھی جینے کا حوصلہ پیدا کرنا جانتی ہے۔ اردو شاعری میں میر کو ان کے غم پسند فطرت کی وجہ سے قنوطی کہا جاتا ہے(۱۸) تو آتش اپنی باحوصلہ شخصیت و شاعری کی بنا پر رجائی شاعر کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔

ماجد کا شعری مجموعہ ''درد منظوم ہوا'' کا مطالعہ کرنے سے قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو رجائیت کی عینک سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ وہ ہر قسم کے حالات و واقعات کے ساتھ ٹکرانے اور آخری دم تک مقابلہ کرنے کی فطرت کے حامل انسان ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ قاری میں بھی زندگی اور معاملات زندگی کے بارے میں ایک امید اور حوصلہ تشکیل دیتا ہے:

زہری و مشتری کہ ہیں زنجیر کے اسیر

تسخیر پھر خلا کریں ہم ایسے مرد ہیں(۱۹)

اسی مضمون میں ان کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں کہ جس میں وہ کٹھن حالات میں بھی چاک گریبانی کی بجائے ڈٹ جانے کو ترجیح دینا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ورنہ انہیں معلوم ہے کہ وہ ہر فن میں طاق ہیں لہٰذا اگر وہ ضمیر سے سمجھوتا کر لیں تو کیا کچھ نہیں پا سکتے۔ مگر

اس سمجھوتے کا تصور ان کے مزاج کے مسلک میں موجود ہی نہیں:

ماجد نہیں کرتے ہیں کبھی چاک گریباں
اے دوست! وگرنہ ہمیں کیا کیا نہیں آتا(۲۰)

خیال اور پیش کش کی ندرت کسی بھی ادیب کی ادبی زندگی کا تعین کرتی ہے۔ کوئی بھی شاعر اس صلاحیت سے جس قدر مالامال ہو گا اسی قدر اسے دیرپا پذیرائی حاصل ہو گی۔ یہ رنگ دو حالتوں میں جنم لیتا ہے ایک تو یہ کہ شاعری میں کوئی ایسا خیال لایا جائے جو نیا اور اچھوتا ہو اور اسے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ قرات کرنے والوں کے دل و دماغ پر ڈیرے جمالے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خیال یا مضمون بے شک پرانا یا روایتی ہو مگر اس کو اس طرح سے باندھا جائے کہ وہ قاری کے جذبات و احساسات کو فوری گرفت میں لے لے اور یوں لگے کہ اس مضمون کو شعر میں لانے کا حق ہی اب ادا ہوا ہے۔ یہ دونوں صورتیں میر و غالب کے کلام کا طرہ امتیاز ہیں۔

ماجد مشتاق کے کلام میں بھی ندرت ادا کے یہ دونوں رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ انہوں نے بعض ایسے مضامین کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے جو شاعری کے میدان میں نئے ہیں تو بعض استعمال شدہ خیالات کو پیش کش کے ذریعے تازگی عطا کر دی ہے۔ نامہ بار کے ہاتھ محبوب کے خط کا انتظار غزل میں کوئی نیا مضمون نہ سہی لیکن زیر نظر شاعر نے پیش کش کے ذریعے اسے نئی زندگی عطا کر دی ہے:

یوں نامہ بر کے منتظر رہیے تو کس لیے
ماجد صبا کے ہاتھ ہی پیغام دے دیا(۲۱)

معشوق کا شرم و حجاب ہر دور کے شاعر نے اپنے اپنے انداز میں اپنی شاعری میں ڈھالا ہے۔ ماجد نے بھی اس کوشش میں بساط بھر اپنا حصہ ڈالا ہے جس میں وہ اپنی الگ پہچان بنانے میں خاصی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں:

کیا جانے کس خیال سے شرما گیا ہے وہ
اہل نظر سے بڑھ گئی ہے آبروئے گل(۲۲)

ندرت ادا کی مثال کے طور پر ایک اور شعر دیکھیے کہ شعر پڑھتے ہی دل خود بخود شاعر کے لیے داد کے ڈونگرے برسانے کے لیے اچھل اچھل جاتا ہے:

تعبیر یہ ہے انگلیاں اپنی فگار ہیں
خوابوں میں ہم نے کی تھی کبھی آرزوئے
گل(۲۳)

موجودہ عہد میں زندگی گزارنا دشوار ترین کام ہو چکا ہے۔ مہنگائی، کج ادائی، بے مروتی، اخلاقی زوال اور معاشرتی ابتذال کیا کیا بلائیں ہیں کہ جو انسانوں کے لیے وبال جان بنتی جا رہی ہیں۔ ان دیگر گوں انسانی حالات و واقعات کو ماجد مشتاق نے اپنے اشعار میں کمال ندرت کے ساتھ اس طرح رقم کیا ہے کہ ان کی شاعری انسانی زندگی کی متنوع صورتوں کا واضح اظہار بن گئی ہے:

زہر پینا، خون پینا، مئے کا پینا ایک ہے
زندگی تیرے لیے اے زندگی، تیرے

لیے (۲۴)

علم اور شعور آگہی کے در وا کرتے ہیں۔ ان سے تاریکی میں روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ اچھے اور برے کی تفریق بھی انہی کے دم سے ہے۔ مگر ہم جس معاشرے میں زندگی کے ایام کی گاڑی کو جیسے تیسے چلا رہے ہیں اس دور میں آگہی نعمت سے زیادہ حساس دلوں کے لیے اذیت اور عذاب کا روپ دھار چکی ہے۔ جوں جوں اشیاء اور تعلقات سے پردے ہٹنا شروع ہوتے ہیں توں توں ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہم تو جیسے کسی غلط مقام یا نشان کے گرد چکر کاٹے جا رہے تھے اور کم علمی کی بدولت جو اعتبار اور یقین کا جہان آباد کر رکھا تھا اس کی اصل حقیقت بہروپ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

ماجد کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی آگہی کے ایسے ہی کرب میں مبتلا ہیں کہ جس کو ترک بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کے ساتھ نباہ بھی ممکن نہیں۔ لہٰذا وہ تنگ آ کر ایسی آگہی کو عذاب سے تشبیہ دیتے ہیں جس نے ان کے شب و روز کے معمولات کو خراب کر رکھا ہے اور جس سے نجات کی کوئی بھی صورت بظاہر تو ممکن نظر نہیں آتی:

زندگی خراب ہو تو کیا کریں
وقت بے حساب ہو تو کیا کریں
روشنی ہی روشنی ہے چار سو
روشنی عذاب ہو تو کیا کریں (۲۵)

ماجد کے کلام کو پڑھتے ہوئے کلاسیکی و جدید شعرا کے بعض اشعار کی فکری و فنی مماثلتیں یا تضاد بھی شعر پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ جیسے میر اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو (۲۶)

میر کے اس شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ماجد مشتاق کا ایک شعر دیکھیے کہ جس میں وہ عشق میں میر کے درج بالا تصور کی ضد نظر آتے ہیں۔ میر محبت میں خود کو آرام طلب کہہ کر کسی دیوار کے سائے میں ستانے کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں تو ماجد یار کی طلب کے شوق میں نہ تو دیوار و در کے سائے تلاش کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسی کوئی خواہش ہے۔ ماجد کا یہ شعر ایک طرف تو میر کی یاد تازہ کرتا ہے تو دوسری طرف انہیں میر سے بڑا عشق کا مسافر بھی ثابت کرتا ہے۔ شعر کا مجموعی تاثر ہر لحاظ سے میر کے شعر کے مقابلے کا ہے:

سائے کی ہو تلاش یہ خواہش نہیں رہی
شوق طلب میں ہم رہے دیوار و در سے
دور (۲۷)

اسی طرح غالب کا ایک شعر کہ جس میں وہ اپنی معصومیت، سادگی اور جذبہ شوق کا احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے
ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں (۲۸)

تو لگ بھگ اسی رنگ اور مضمون میں ماجد بھی اپنے داخلی جذبات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں کہ بے ساختہ غالب کا رنگ متخیلہ میں انگڑائی لینے لگتا ہے:

اڑتے ہیں تھوڑی دور ہم موج ہوا کے
ساتھ
ہم چومتے ہیں پاؤں کہ راہوں کی گرد ہیں(۲۹)

وقت گزرنے کے ساتھ انسان کی صلاحیتیں اور جسمانی کارکردگی پہلے جیسی نہیں رہتی۔ غالب کو اس بات کا شدت سے قلق تھا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں(۳۰)

ماجد نے بھی اس شعر میں بیان کردہ تلخ حقیقت کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پہلی ہی قرات میں غالب یاد آجاتے ہیں:

اب مضمحل قوی ہیں بڑھاپے کا در کھلا
کٹنی تھی جتنی خوب جوانی میں کٹ گئی(۳۱)

اگرچہ اردو میں غیر مردف غزل کہنے کا رواج موجود ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ردیف کے بر محل انتخاب اور استعمال سے شعر کا جمالیاتی تاثر اور معنی آفرینی نکھر جاتی ہے۔ ماجد مشتاق کی غزلیات میں اس فنی حربے کا پوری طرح اہتمام ملتا ہے۔ ان کی بعض غزلوں کا تو تمام تار و پود اور دلکشی ان کی اچھوتی اور متحرک ردیفوں کے مرہون منت ہے۔ اس حوالے سے ایک مثال پیش کی جارہی ہے جس کی قرات کا لطف ردیف کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے:

تیرگی کھا گئی شہروں کے اجالے اب کے
زندگی ہو گئی وحشت کے حوالے اب کے(۳۲)

اردو غزل میں استفہامیہ انداز بیان سے مفہوم و معنی کا نیا جہان آباد کرنے کی سب سے عمدہ مثالیں غالب کے ہاں ملتی ہیں جس کی روایت کو آئندہ ادوار کے ہر شاعر نے کسی نہ کسی رنگ میں ضرور آگے بڑھایا ہے۔ متذکرہ شاعر کے ہاں بھی اس رنگ کے اشعار کی بھرپور صورتیں پڑھنے کو ملتی ہیں جس میں زیادہ تر بذات خود ان سے کسی موضوع یا مسلے پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ اس سوال اور جواب کی تکنیک نے شعر کی سادگی میں بھی ایسی پرکاری بھر دی ہے کہ قاری معنی کے ان دیکھے آسمانوں کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا ہے اور جب وہ خیال کی پرواز کو دام میں اسیر کر لیتا ہے تو ایک ایسی سرشاری اس کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے جیسے کل کائنات کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو:

پوچھتے ہیں مجھ سے میری اس نئی بستی کے لوگ
سچ بتانا زندگی کا تجربا کیسا رہا(۳۳)

صنائع بدائع شاعری کے ایسے لوازمات میں شمار ہوتے ہیں کہ جن کا حسب موقع اور حسب ضرورت استعمال کلام کی رنگینی

دوچند کر دیتا ہے۔ لیکن کوئی شاعر اگر ان کے برتنے میں پوری طرح طاق نہ ہو تو یہ الٹا شاعری کی خامی شمار ہونے لگتے ہیں۔

میری ناقص رائے اور محدود علم کا یہ دعوی ہے کہ کلاسیکی اردو غزل میں ولی، میر اور مصحفی نے جس سلیقے اور کثرت سے صنائع بدائع خصوصا تشبیہ و استعارہ سے اپنے کلام کو رنگینی، رعنائی، دلکشی اور فکری معنویت عطا کی ہے کسی دوسرے شاعر نے اس کا اس کثرت اور مہارت سے التزام نہیں کیا۔ اسی طرح جدید شاعری میں فیض، اقبال، فراز اور پروین شاکر کے سر یہ اعزاز جاتا ہے کہ انہوں اس فنی خوبی سے جمالیاتی و فکری ندرت کے اچھوتے نمونے تشکیل دیے ہیں۔

ماجد کی شاعری میں اگرچہ کثرت سے ان لوازمات کا وجود نہ بھی ہو لیکن منفرد اور مثالی بنت کاری سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص ان کی غزلیات میں تشبیہاتی رنگارنگی سے قاری ضرور محظوظ ہوتا ہے:

قوس قزح تھی معنی و آہنگ و لفظ کی
تہذیب آگہی کا نیا تجربا دیا(۳۴)

محبوب کے چہرے کی خوب صورتی کو اجاگر کرنے کے لیے اسے چاند، ماہ، ماہ چار دہم وغیرہ سے تشبیہ دینے کا رواج قلی قطب کے دیوان سے لے کر دور حاضر کے ہر شاعر کی شاعری میں جابجا پڑھنے کو ملتا ہے۔ ماجد مشتاق کے دیوان میں بھی اس کی متنوع صورتیں پوری فکری جولانی کے ساتھ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہیں۔ مثلا وہ اپنے یار طرح دار کے چہرہ رنگین کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ چاند تھا کہ تھا چاندنی بدن اس کا
وہ دودھ چہرے بہت بے مثال سامنے تھے(۳۵)

مجموعی طور پر ماجد مشتاق کی اس شعری کاوش کو ایک کامیاب تجربہ کہتے ہوئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی شاعری کا یہ مجموعہ ادب کے قارئین کے لیے خوشبو سے لبریز تازہ ہوا کا ایسا جھونکا ہے جس کی لطافت اور اثر آفرینی دیر تک محسوسات کو تازہ رکھے گی۔

حوالہ جات

۱۔ ماجد مشتاق رائے، ڈاکٹر، درد منظوم ہوا، فیصل آباد: لائل پور پبلشرز، ۲۰۲۳ء، ص: ۲۴

۲۔ ایضاً، ص: ۶۰

۳۔ ایضاً، ص: ۱۰۴

۴۔ ایضاً، ص: ۱۰۸

۵۔ ایضاً، ص: ۱۱۹

۶۔ ایضاً، ص: ۳۶

۷۔ ایضاً، ص: ۳۲

۸۔ ایضاً، ص: ۱۶

۹۔ ایضاً، ص: ۱۹

۱۰۔ ایضاً، ص: ۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۰۲

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۶

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۸

۱۴۔ ایضاً، ص: ۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص: ۶۹

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۶

۱۸۔ خوشحال زیدی، ڈاکٹر، میر تقی میر شخصیت اور فن، دہلی: کلر پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۵ء، ص: ۶۴

۱۹۔ ماجد مشتاق رائے، ڈاکٹر، درد منظوم ہوا، ص: ۲۰

۲۰۔ ایضاً، ص: ۵۳

۲۱۔ ایضاً، ص: ۳۰

۲۲۔ ایضاً، ص: ۴۲

۲۳۔ ایضاً، ص: ۴۳

۲۴۔ ایضاً، ص: ۹۰

۲۵۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، کراچی: اردو دنیا، ۱۹۵۸ء، ص: ۴۸۴

۲۶۔ ماجد مشتاق رائے، ڈاکٹر، درد منظوم ہوا، ص: ۱۲۰

۲۷۔ غالب، اسد اللہ خاں، میرزا، دیوانِ غالب، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۰۷ء، ص: ۹۳

۲۸۔ ماجد مشتاق رائے، ڈاکٹر، درد منظوم ہوا، ص: ۱۰۹

۲۹۔ غالب، اسد اللہ خاں، میرزا، دیوانِ غالب، ص: ۸۰

۳۰۔ ماجد مشتاق رائے، ڈاکٹر، درد منظوم ہوا، ص: ۱۹

۳۱۔ ایضاً، ص: ۱۰۰

۳۲۔ ایضاً، ص: ۵۶

۳۳۔ ایضاً، ص: ۱۱۰

۳۴۔ ایضاً، ص: ۵۱

۳۵۔ ایضاً، ص: ۵۵